# اغوا برائے تاوان

کاشف زبیر

جرم کی تاریخ حضرت انسان جتنی ھی قدیم ھے، قتل، ڈکیتی، چوری، اغوا، اغوا برائے تاوان، دھوکا دہی یہ سب جرم کے ذیل میں آتے ھیں اور تمام ترقانون سازی اور سزاؤں کے باوجود آج کی دنیا میں موجود ھیں۔ انھی میں سے ایک جرم کے وقوع پذیر ھونے اور اس کی تفتیش کی سچی روداد، اس جرم کی خاص بات یہ تھی کہ اس کا شکار کوئی عام فرد نہیں بلکہ ایک نامور شخص ھوا تھا۔

جرم وسزا کی تاریخ سے معمور ایک جرم کی حقیقی داستان

اغوا برائے تاوان کا پیشہ کتنا پرانا ہے، غالباً اتنا پرانا جب انسان نے دولت کی قدر کو قیمتی اور مختصر اشیا کی صورت میں جمع کرنا شروع کیا تھا۔ اغوا برائے تاوان کے اولین باقاعدہ کیس کا سراغ ہمیں آج سے کوئی چار ہزار سال پہلے مصر میں ملتا ہے جب دولت مندوں نے فرعونِ وقت کے روبرو دہائی دی کہ انہیں اغوا کاروں سے بچایا جائے جو ان کے بزرگوں کی لاشیں قبروں سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور منہ مانگے تاوان کے عوض واپس کرتے ہیں۔ یہ لٹیرے اتنے دیدہ دلیر ہیں کہ پہرے داروں کی موجودگی میں اپنا کام کر جاتے ہیں۔ فرعون نے جواب دیا تھا کہ وہ خود اپنے بزرگوں کے بارے میں فکرمند ہے۔ جنہیں ان لٹیروں سے زیادہ خطرہ ہے کیونکہ بوقتِ تدفین ان کے ساتھ ان کا خزانہ بھی دفن کیا جاتا تھا اور اسے ان چوروں سے محفوظ رکھنے کے لیے پیچیدہ طریقوں سے چھپایا جاتا تھا۔ اوّل تو بادشاہ دور دراز صحرا میں دفن ہونا پسند کرتے تھے کیونکہ مضبوط ترین اہرام بھی ان لٹیروں سے محفوظ نہیں تھے۔ وہ نقب لگا کر فرعون کا خزانہ مع اس کی ممی (سومیائی ہوئی لاش) کے اڑا کر لے جاتے تھے کیونکہ فرعون کی ممی بھی قیمتی اشیا میں شمار ہوتی تھی اور جادوگری کے شائق اس کے بدلے بھاری رقم دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہا کرتے تھے۔

BY SALIMSALKHAN

یہ ساری کہانی ایک قدیم مندر کی دیوار پر کندہ ہے جو مصر کے تاریخی شہر کے کھنڈرات میں موجود ہے۔ یہ وہ شہر ہے جسے مصر میں روحانیت اور ایک طرح سے پجاریت کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس کی حیثیت آج کے ویٹیکن سٹی یا ہندوؤں کے مقدس مقام تھرا سے کم نہیں تھی۔ شاہی خاندان کے شہزادے تعلیم و تربیت کے لیے یہاں بھیجے جاتے تھے۔ معبدوں کا یہ شہر اب سے کوئی تین ہزار سال پہلے یکا یک غائب ہوگیا تھا اور بعد میں اس کے کھنڈرات پچھلی صدی میں دریافت ہوئے تھے۔

بات ہو رہی تھی اخوا برائے تاوان کی..... تو اس کا تاریخی ریکارڈ سب سے پہلے مصر میں ملتا ہے۔ اس وقت مصر میں بنی اسرائیلی مسلح کے منصب سے گر کر غلام قوم بن چکے تھے اور مصری تہذیب کی جھوٹی شان و شوکت انہیں پوری طرح مرعوب کر چکی تھی۔ دولت سے محبت اور اس کے لیے متعدد اخلاقی اور قانونی برائیاں ان میں در آئی تھیں۔ وہ جرائم کرتے تھے اور اسے چھپانے کے لیے قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ یہ مصری چوروں کے ساتھ مل کر قبروں سے دولت اور مردے چراتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ تاوان کی غرض سے امرا کے بچے بھی اغوا کر کے لے جاتے تھے۔ ان کی شوریدہ سری کا یہ عالم تھا کہ دارالحکومت میں بھی وارداتوں سے باز نہیں آتے تھے۔ مصری امرا ان سے اتنا تنگ تھے کہ ان سے بچانے کے لیے اپنے بچوں کو دور دراز شہروں میں بھیج دیا کرتے تھے۔

مصری حکومت ان لٹیروں اور اغوا کاروں سے نمٹنے کے لیے سختی کا ہتھیار استعمال کرتی تھی اور اس کا زیادہ تر نشانہ بے گناہ بنی اسرائیلی ہوتے تھے۔ جب حکومت کا جلال حرکت میں آتا تو مصری فوج ان کے محلوں میں گھس جاتی تھی' سامنے آنے والے ہر شخص کا بے دریغ قتلِ عام کرتی تھی۔ مصری بنی اسرائیلیوں سے زمین پر کاشت کراتے تھے اور ان سے بڑے شہروں اور دوسری عمارتوں کی تعمیر میں مزدور کے طور پر بیگار لیا کرتے تھے۔ ان کی بستیاں دریائے نیل کے کنارے اور تمام بڑے شہروں کے مضافات میں تھیں۔ انہیں عام مصریوں کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایسے میں ایک قتلِ عام میں مصری فوج نے چار ہزار کے قریب اسرائیلی باشندے ہلاک کر دیے تھے اور ان کی لاشیں دریائے نیل کے محافظ مقدس مگرمچھوں کو کھلا دی تھیں۔ اس قتلِ عام کا پتا بھی ایک کتبے سے چلتا ہے' یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوئی دو سو سال پہلے کی بات تھی۔

بنی اسرائیلیوں کے آٹھ سو سالہ دور میں مصریوں میں بھی خرابیاں آئی تھیں۔ ایک تو انہیں کام نہ کرنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ دوسرے وہ جرائم کرنے لگے تھے۔ مجرمانہ سرگرمیوں کی وجہ سے بے شمار طاقت ور مسلح گروہ وجود میں آ گئے تھے۔ یہ گروہ حکومت کے قابو سے باہر تھے۔ شہروں سے باہر راستوں اور دریائے نیل پر ان کا تسلط تھا اور انہوں نے نقل و حمل کو دشوار بنا دیا تھا۔ کہا جاتا ہے انہوں نے دنیا میں پہلی بار اغوا برائے تاوان کے جرم کو منظم حیثیت دی تھی۔ اس زمانے میں یہ لٹیرے پورے فوجی دستوں کو اغوا کر کے لے جاتے تھے۔ امرا ان کے رحم و کرم پر تھے۔ عام طور سے بنی اسرائیلی نوجوان بے گار سے بچنے کے لیے فرار ہو کر ان مسلح گروہوں میں شامل ہو جاتے تھے۔ حکومت کی ظلم و زیادتیوں سے تنگ یہ نوجوان ان گروہوں کے بہترین آلۂ کار ثابت ہوتے تھے۔ شاید دنیا میں پہلی بار منظم جرائم کو بھی انہوں نے ہی وجود بخشا تھا۔

اغوا برائے تاوان کے سلسلے میں زمانۂ قدیم میں ایک اور نام سامنے آتا ہے۔ یہ قزاق تھے جو سمندروں میں لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔ آج سے کوئی پانچ ہزار سال پہلے شام اور ترکی کے ساحلوں سے قدیم عربوں نے جہاز رانی کا آغاز کیا تھا اور بہ تدریج افریقا کے ساتھ پھیلتے چلے گئے۔ فونیقی کہلانے والے یہ دنیا کے اولین تاجر تھے جنہوں نے تین براعظموں کو اپنی تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بنایا یعنی ایشیا' افریقا اور یورپ۔ فونیقی اگرچہ ایشیا اور یورپ میں بھی اپنے تجارتی ٹھکانے رکھتے تھے مگر انہوں نے اپنے مرکز کے طور پر افریقا کو چنا تھا۔ موجودہ مراکش کے مقام قرطاجنہ نامی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ وہ تینوں براعظموں میں ضرورت کی اشیا کی تجارت کر کے بے اندازہ دولت کمانے لگے تھے۔ مصر کی پیداوار کی تجارت بھی ان کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ یورپ اس وقت زمانۂ تاریکی سے گزر رہا تھا۔ صرف مشرقی یورپ میں یونان اور اٹلی زندگی گزارنے کے طریقوں کی حد تک متمدن تھے۔ پورا یورپ بندرگاہوں کے لحاظ سے بھرپور مواقع رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جلد فونیقیوں کے ساتھ یورپی اقوام بھی سمندر میں اتر آئی تھیں جو اس سے پہلے صرف عربوں کے قبضے میں تھا۔

یورپی تاجر تو نہیں البتہ سپاہی اچھے ثابت ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے جنگ اور لوٹ مار کو پیشہ بنایا۔ رومن سلطنت نے بحریہ بنائی جو فونیقی سلطنت کے خلاف نبرد آزما رہتی تھی۔ اس کے متوازی یورپ سے بحری قزاقوں کے گروہ اٹھنے لگے۔ یہ بھی فونیقی بحری جہازوں پر حملے اور لوٹ مار کرنے کے ساتھ تاجروں کو غلام بنا کر لے جاتے تھے۔ ان سے بیگار لیتے تھے مگر پھر انہوں نے تاجروں کو تاوان کے لیے اغوا کرنا شروع کر دیا۔ اس سے ان کو اتنا فائدہ ہوا کہ انہوں نے لوٹ مار کے ساتھ اغوا برائے تاوان کو متوازن پیشہ بنا لیا۔ بعض اوقات تجارت اور سلطنت کو ان قزاقوں نے بھی پناہ نقصان پہنچایا تھا۔ رومن سلطنت ان کی پشت پناہی کرتی تھی۔ جب فونیقی سلطنت ختم ہوگئی اور بحیرۂ روم میں تجارت رومنوں کے ہاتھ میں آئی تو قزاق ان کو لوٹنے لگے اور اغوا برائے تاوان میں اب رومن تاجروں اور امرا کے بدلے منہ مانگا تاوان وصول کرنے لگے۔ یہ جنگی جہازوں تک پر حملہ کر دیتے تھے۔ کئی نامور رومن سینیٹرز اور جنرلز تک اغوا ہو چکے تھے حتیٰ کہ مشہور رومی جنرل سیزر کو اغوا کر کے اس کا تاوان وصول کیا گیا تھا۔ بعد میں پومپئی نے بڑی حد تک بحیرۂ روم میں ان قزاقوں کا خاتمہ کر کے سفر کو محفوظ کر دیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیگر جرائم کی تکنیک اور طریقوں میں فرق آتا گیا۔ قزاقی ہر دور میں نفع بخش لیکن خطرناک پیشہ رہا ہے۔ اس میں ایک طرف مال آنے کا امکان ہوتا ہے' تو دوسری جانب جان جانے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ سامنے آنے کی وجہ سے آدمی کی شناخت ہو جاتی تھی مگر اغوا برائے تاوان میں یہ خطرہ نہیں تھا۔ کسی کو اغوا کر کے اسے چھپا کر رکھا جاتا تھا اور ایسے طریقوں سے اس کا تاوان وصول کیا جاتا تھا کہ مجرموں کو سامنے نہ آنا پڑے۔ اس طرح وہ جرم کر کے بھی معاشرے میں معزز بن کر رہتے تھے۔ آج تک اغوا برائے تاوان میں یہی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جدید دور میں جہاں سائنس نے جرائم کی تفتیش میں مدد دے کر جرائم کے سدِباب میں مدد دی ہے وہیں معاشرتی ناہمواریوں اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے اغوا برائے تاوان کو بھی ترقی دی ہے۔ گزشتہ صدی کے آغاز میں امریکا میں اغوا برائے تاوان کا دھندا عروج پر تھا۔ خاص طور سے بچوں کو اغوا کیا جاتا تھا کیونکہ بچے کو لے جانا آسان تھا۔ انہیں چھپا کر رکھنا بھی مسئلہ نہیں تھا اور ان کے فرار کا خدشہ بھی نہیں رہتا تھا۔ سب سے اہم بات تھی کہ بچے بعد میں مجرموں کو شناخت بھی کر لیتے تو ان کی گواہی پر مجرموں کو سزا نہیں ہوتی تھی۔ بچوں کے ماں باپ ان کو واپس حاصل کرنے کے بدلے منہ مانگا تاوان دینے کو تیار ہو جاتے تھے۔ بس یہ ہوتا تھا کہ بچوں کے اغوا پر پولیس زیادہ مستعدی سے سرگرمِ عمل ہو جاتی تھی۔

چارلس برگ ایسا شخص تھا جسے دولت بھی ملی اور ساتھ ہی انتہا درجے کی شہرت اور عزت بھی۔ وہ اس زمانے میں ہوابازی کرتا تھا جب طیاروں کو فضا میں بلند ہوتے مشکل سے ایک عشرہ گزرا تھا۔ ہوابازی کو موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے سے زیادہ خطرناک پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ طیارہ سازی ابتدائی مراحل میں تھی اور بننے والے طیارے طویل مسافت طے کرنے کے لیے ناموزوں تھے۔ خاص طور سے سمندر پر پرواز کرنے کا سوچ کر ہوابازوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں چارلس برگ نے تن تنہا طیارے پر بحرِ اوقیانوس عبور کرنے کا خواب دیکھا اور صرف خواب ہی نہیں دیکھا' اس نے اسے عملی جامہ بھی پہنایا۔ 21 مئی 1927ء کے دن اس نے اکیلے مسلسل تینتیس گھنٹے اپنے دو انجنوں والے طیارے پر پرواز کی اور امریکا سے یورپ جا پہنچا تھا۔ اس وقت نہ صرف امریکا بلکہ یورپ کے لوگوں کی نظریں بھی اس پرواز پر مرکوز تھیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ چارلس برگ نے جس جگہ لینڈنگ کیا وہاں ایک لاکھ سے زیادہ افراد اس کے استقبال کے لیے موجود تھے اور جب وہ واپس امریکا آیا تو اس کا استقبال قومی ہیرو کی طرح کیا گیا تھا۔ وہ جہاں جاتا' اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے لوگوں کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ ان دنوں امریکا میں اس سے زیادہ مقبول شخص کوئی نہیں تھا' کوئی اخبار یا میگزین ایسا نہیں تھا جس میں اس کی تصویر نہ چھپی ہو۔ اسے سرکاری تقریبات میں مدعو کیا جاتا تھا حتیٰ کہ اسے وہائٹ ہاؤس میں بھی مدعو کیا گیا تھا۔

ایک طرف تو چارلس پر بہ ظاہر قسمت کی دیوی مہربان تھی۔ دوسری طرف ایسا حادثہ اس کی تاک میں تھا جس نے نہ صرف اس کی بلکہ اس کے خاندان کو بھی آنے والے برسوں میں غموں اور دکھوں کے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ اس سے اس کی دولت نہیں چھنی تھی نہ ہی اس کی مقبولیت میں کمی آئی تھی بلکہ اس واقعے کے بعد اس کے لیے لوگوں کی محبت اور ہمدردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

اس کے ساتھ یہ اندوہناک واقعہ پیش آیا کہ مارچ 1932ء میں کسی نے اس کے صرف ایک سال اور سات مہینے کے بچے کو اغوا کر لیا۔ اس واقعے سے اس پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ یہ چارلس اور اس کی بیوی کا ایک ہی بچہ تھا۔

چارلس برگ جونیئر بسٹر نامی یہ بچہ اپنے خاص کمرے سے غائب پایا گیا تھا۔ چارلس برگ نے ریاست نیو جرسی کے شہر ہوپ ویل میں مضافاتی علاقے میں شاندار گھر بنا لیا تھا۔

اس مکان کے چاروں طرف وسیع سبزہ زار اور پاس ہی جنگل بھی تھا۔ مکان ویرانے میں تھا اور واقعے والے دن بارش جاری تھی لہٰذا کسی نے بھی انھوا کرنے والے کو آتے یا جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس دن پورے خاندان کا دوسرے شہر اینگل ووڈ جانے کا پروگرام تھا مگر بدقسمتی سے بارش کا آغاز ہوگیا اور یہ واقعہ پیش آ گیا۔ چارلس ساری عمر اس بات پر پچھتاتا رہا۔ اگر اس روز بارش نہ ہوتی اور وہ اور اس کی بیوی فلو میں مبتلا نہ ہوتے تو وہ اینگل ووڈ چلے جاتے اور ننھا بسٹر انھوا نہ ہوتا۔

چارلس اور اس کی بیوی کا ارادہ تھا کہ اب وہ اگلے دن اینگل ووڈ کے لیے روانہ ہوں گے۔ جہاں چارلس برگ کی جوان اور حسین بیوی این چارلس کا میکا تھا۔ شام کے وقت این اور بچے کی آیا ہیتی نے ننھے بسٹر کو نہلا کر اس کے بستر پر سلا دیا تھا۔ اب بسٹر صبح چھ بجے ہی بیدار ہوتا جب اسے بھوک لگتی اور اسے کوئی حاجت ہوتی۔ این اس کام سے فارغ ہو کر مکان کے نچلے حصے میں واقع اپنے بیڈروم میں آئی جہاں چارلس آرام کر رہا تھا۔ سارے دن کے آرام سے ان کے فلو میں خاصا افاقہ ہوا تھا۔ اس وجہ سے بھی وہ اگلے روز اینگل ووڈ جانے کے لیے تیار تھے۔

ننھے بسٹر کا کمرا اوپر والی منزل پر تھا' اس کمرے میں کئی ایک کھڑکیاں تھیں اور سب بند تھیں سوائے ایک کے۔ کیونکہ یہ کھڑکی جام ہونے کی وجہ سے ذرا سی کھلی تھی اور نہ اوپر جاتی تھی نہ نیچے آتی تھی۔

نو بجے ان سب نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد سب اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ آیا ہیتی کا کمرا ننھے بسٹر کے کمرے کے برابر میں تھا۔ چارلس اور این اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ رات دس بجے تک سونے کے لیے لیٹ جاتے تھے۔ جس وقت چارلس لیٹنے کی تیاری کر رہا تھا' اس نے اوپر والی منزل سے ایک زوردار آواز سنی جیسے لکڑی کی کوئی شے ٹوٹی ہو۔ چارلس چونکا تھا لیکن جب کوئی اور آواز نہیں آئی تو وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ بارش کے بعد آس پاس کے جنگلوں سے اس طرح کی لکڑی چٹخنے جیسی آوازیں آتی رہتی تھیں مگر چند منٹ بعد ہی ہیتی ان کے کمرے کا دروازہ بجا رہی تھی۔

''مسٹر چارلس! لیڈی چارلس دروازہ کھولیں۔''

این نے جا کر دروازہ کھولا تھا ''کیا بات ہے ہیتی؟''

''مادام! کیا..... ننھے بسٹر کو مسٹر چارلس لے کر آئے ہیں نیچے؟''

چارلس کبھی کبھی ہیتی کو تنگ کرنے کے لیے اس قسم کے مذاق کرتا اور اس کی نظر بچا کر ننھے بسٹر کو نیچے لے آتا تھا مگر اس روز چارلس نے گزشتہ تین گھنٹے سے بسٹر کو نہیں دیکھا تھا۔ این نے جواب دیا ''نہیں' بسٹر یہاں نہیں ہے ہیتی..... مگر تم.....؟''

''بسٹر یہاں نہیں ہے؟'' ہیتی اس کی بات کاٹ کر چلائی ''مادام! وہ اوپر بھی نہیں ہے۔''

یہ سنتے ہی چارلس اور این دیوانہ وار اوپر کی طرف بھاگے تھے۔ ہیتی ان کے پیچھے تھی۔ سب سے پہلے این نے بسٹر کا خالی پالنا دیکھا اور اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی تھی۔ جبکہ چارلس برگ دم بہ خود رہ گیا تھا پھر وہ چلایا ''این' کسی نے ہمارے بچے کو انھوا کر لیا ہے۔''

''کیسے؟'' این بولی تھی پھر سب کی نظریں کھلی کھڑکی پر جم گئی تھیں جو جام ہونے کی وجہ سے ویسے ہی چھوڑ دی گئی تھی۔ یہ کھڑکی اب اتنی کھلی تھی کہ اس سے ایک آدمی بہ آسانی گزر سکتا تھا۔ جب کہ سات بجے چارلس اور این خود اس کھڑکی کو بند دیکھ چکے تھے۔ یعنی اس منجمد پوزیشن میں' جس میں یہ کئی مہینوں سے چلی آ رہی تھی۔ بسٹر کو اس کمرے میں ایک ہفتے پہلے ہی منتقل کیا گیا تھا۔ کھڑکی کو اس طرح کوئی طاقت ور شخص ہی کھول سکتا تھا۔ اچانک چارلس کی نگاہ لکڑی کے پاس فرشی قالین پر پڑے بھورے رنگ کے لفافے پر پڑی۔ این نے بھی لفافہ دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھی لیکن چارلس نے اسے روک لیا۔

''اسے ہاتھ مت لگانا۔ میں پولیس کو اطلاع دینے جا رہا ہوں۔''

پولیس کو اطلاع دے کر چارلس واپس آیا تو اس کی بیوی بسٹر کے خالی پالنے کے پاس کھڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ پالنے کے نرم و ملائم تکیے پر بسٹر کے سر کا نشان واضح تھا۔ بچہ میاں بیوی کی طرح خوبصورت اور صحت مند تھا۔ اس کے سر پر ہلکے گھنگھریالے بال تھے اور ہونٹوں پر ہمہ وقت مسکراہٹ کھیلتی رہا کرتی تھی۔ وہ بہت کم روتا یا ماں اور آیا کو تنگ کیا کرتا تھا۔ اسے موٹر کار میں سفر کرنا اچھا لگتا تھا۔ این نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا ''چارلس' ہمارا بچہ مل جائے گا ناں؟''

''این! حوصلہ رکھو۔'' چارلس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ درحقیقت خود اسے حوصلے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بچہ اس کی زندگی تھا اور اس کے بغیر وہ خود کو بے جان محسوس کر رہا تھا۔ ذرا دیر بعد اس کا گھر پولیس والوں سے بھر گیا۔ ان کی آمد سے ذرا پہلے چارلس نے کھڑکی یا اس کی



BY SALIMSALKHAN

چوکھٹ کو ہاتھ لگائے بغیر اس سے نیچے جھانکا تو اسے ایک لکڑی کی سیڑھی نظر بھی آئی تھی' جس کا اوپری حصہ اس طرح ٹوٹا تھا جیسے سیڑھی کو کسی نصب جگہ سے اکھاڑ کر لایا گیا ہو۔ پہلی نظر میں وہ چارلس کو اپنے تہ خانے کی سیڑھی لگی تھی۔ چارلس کو معلوم تھا' جائے واردات پر کسی شے کو چھونے یا اپنی جگہ سے ہلانے کی صورت میں پولیس کو اپنے کام میں دشواری پیش آ سکتی تھی' اس طرح سے کوئی ثبوت ضائع ہو جاتا' جس کا سراسر فائدہ مجرم کو ہوتا۔ پولیس نے آتے ہی سب سے پہلے لفافہ اپنے قبضے میں کیا۔ اس پر سے ممکنہ فنگر پرنٹ اٹھانے کے بعد ایک پولیس افسر نے اسے چاک کیا تو اس کے اندر سے ایک دھمکی آمیز رقعہ نکلا۔ اس میں لکھا تھا کہ بچہ ان کے قبضے میں ہے اور اس کی صحیح سلامت واپسی اسی صورت میں ممکن ہے کہ انہیں پچاس ہزار ڈالرز دیے جائیں۔

اس رقعے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ بچے کو بچ انھوا کر لیا گیا ہے اور وہ اس وقت سفاک مجرموں کے قبضے میں ہے۔ ورنہ اب تک چارلس اور این کے دلوں میں یہ امید تھی کہ شاید کسی نے ان کے ساتھ یہ مذاق کیا ہے۔ پولیس افسران نے کھڑکی کے نیچے زمین کا جائزہ لیا۔ سارا دن ہونے والی بارش کی وجہ سے زمین گیلی اور نرم تھی' اس پر دو مردانہ جوتوں کے نشانات واضح تھے۔ اس کے ساتھ ہی پولیس کے جوانوں نے طاقتور سرچ لائٹوں کی مدد سے مکان کے اردگرد کے باغ اور جنگل کو چھاننا شروع کر دیا لیکن چالاک مجرم نے اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔ سوائے پاؤں کے نشانات' لفافے اور رقعے اور لکڑی کی اس بھدی سی سیڑھی کے۔

چارلس کا خیال تھا کہ اس نے ہیتی کے آنے سے ذرا پہلے جو لکڑی چٹخنے جیسی آواز سنی تھی' وہ دراصل تہ خانے سے سیڑھی اکھاڑے جانے کی تھی لیکن تہ خانے کے معائنے کے بعد اس کی سیڑھی اپنی جگہ پائی گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ سیڑھی بھی مجرم یا مجرمان اپنے ساتھ لائے تھے اور جاتے وقت غلط میں اسے یہیں چھوڑ گئے تھے۔

چارلس نے پولیس افسران کو اس پُراسرار آواز کے بارے میں بتایا۔ جائزے کے بعد پولیس نے اسے جام کھڑکی کھلنے کی آواز قرار دیا تھا۔ یہ اوپر اور نیچے حرکت کرنے والی کھڑکی تھی اور اس کے اوپری حصے کی خراشوں سے ظاہر تھا کہ اسے زبردستی کھولا گیا ہے۔ ساری صورتِ حال واضح تھی۔ مجرمان مکان کے اندر کے نقشے اور خاص طور سے بسٹر کے کمرے سے پوری طرح آگاہ تھے۔ حتیٰ کہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ کون سی کھڑکی خرابی کے سبب کھلی رہتی ہے۔ انہوں نے صرف اس کے نیچے سیڑھی رکھی تھی۔ گیلی زمین پر باقی کھڑکیوں تلے کی جگہ بالکل صاف تھی۔ مجرم صرف بچے کو اٹھانے کے ارادے سے آئے تھے۔ انہوں نے کسی اور شے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ فنگر پرنٹ کا کوئی نشان نہیں ملا۔ حتیٰ کہ ان چیزوں پر بھی نہیں جو مجرم اپنے ساتھ لائے تھے یعنی لکڑی کی سیڑھی اور لفافہ و رقعہ۔ اس سے بھی ظاہر تھا کہ مجرم کتنے چالاک اور مستقبل کے تمام خطرات سے پوری طرح واقف تھے۔

ان حالات میں اولین شک یہی تھا کہ مکان میں موجود کوئی فرد یا کوئی ایسا فرد مجرموں سے ملا ہوا تھا جس کا چارلس کے گھر میں آنا جانا تھا اور اس نے نہ صرف مکان کے نقشے بلکہ چارلس کی مالی حالت سے بھی مجرموں کو آگاہ کیا تھا۔ پچاس ہزار ڈالرز آج کے کئی لاکھ ڈالرز کے مساوی تھے اور چارلس یہ رقم ادا کر سکتا تھا۔ پولیس کا شبہ فطری طور پر ملازمہ ہیتی پر گیا تھا۔ وہ فرانسیسی نژاد امریکن تھی جس کے آباؤ اجداد دو سو سال پہلے فرانس سے ترکِ وطن کر کے امریکا آئے تھے' ہیتی نرس بننا چاہتی تھی اور اس مقصد کے لیے رقم جمع کرنے کے غرض سے اس نے یہ ملازمت کی تھی۔ اس کی شخصیت دلکش اور نرم تھی۔ مناسب لباس میں وہ کسی صورت ایک گھر کی ملازمہ نہیں لگتی تھی۔ چارلس اور این نے اس کا انتخاب کئی امیدواروں میں سے خوب چھان پھٹک کر کیا تھا۔ ہیتی کو بسٹر کی پیدائش کے فوری بعد رکھ لیا گیا تھا اور گزشتہ ڈیڑھ سال کے عرصے میں ہیتی ایک طرح سے ان کے گھر کے فرد کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ وہ اس کی شرافت' ایمانداری اور خلوص کے اس حد تک قائل تھے کہ جب دو پولیس افسران خاص طور سے ہیتی سے پوچھ گچھ کرنے آئے تو چارلس نے ان پر واضح کر دیا۔

''آپ بے شک اس سے سوالات کر سکتے ہیں لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ ہم ہیتی پر شک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بچے کے اغوا ہونے پر اس کا دکھ اور ملال ہمارے سامنے ہے۔ وہ ہماری طرح پریشان ہے۔''

چارلس اور این کی جانب سے گواہی کے باوجود پولیس نے ہیتی سے سرگرمی سے تفتیش کی اور اس کے پس منظر کو بھی کھنگالا تھا مگر ہیتی میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جو اسے مشکوک ظاہر کرتی۔ جہاں تک مجرم یا مجرمان کو معلومات کی فراہمی کا تعلق تھا تو اس کے بے شمار راستے اور بھی تھے۔ چارلس کے گھر کئی افراد کا آنا جانا تھا۔ اس کا خاندان وسیع تھا اور اس کے زیادہ تر رشتے دار نیویارک کے آس پاس آباد

تھے اور ان میں سے کسی نہ کسی کی آمد رفت جاری رہتی تھی۔ کئی افراد چارلس کے مکان اور اندر کی باتوں سے واقف تھے۔

ایک طرف پولیس سرگرمی دکھا رہی تھی تو دوسری طرف میڈیا نے اس خبر کو پوری دلچسپی سے لیا اور اغوا کے اگلے روز ملک بھر کے اخبارات میں اس خبر کو بھرپور طریقے سے شائع کیا گیا تھا۔ اخبارات نے ان شقی القلب مجرموں کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا تھا جنہوں نے چارلس اور این سے ان کا بچہ چھین لیا تھا۔ بیشتر اخبارات نے پولیس اور اعلیٰ حکام پر زور دیا تھا کہ وہ بسٹر کی بازیابی اور مجرموں کی تلاش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ ساتھ ہی اخبارات نے ریاستی اسمبلی سے مطالبہ کیا تھا کہ بچے کے اغوا کو سنگین جرم قرار دے کر اس کے مرتکب افراد کو سزائے موت دی جائے۔

اگلے روز اخبارات کا رویہ مزید سخت تھا اور انہوں نے مجرم یا مجرموں کی گرفتاری کے مطالبے کے ساتھ انتظامیہ کی نااہلی پر تنقید شروع کر دی تھی جو جوں جوں گھنٹے گزرنے کے بعد بھی مجرموں کا سراغ لگانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی اور یہ حقیقت تھی کہ مجرم یا مجرمان نے سارا کام اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ پولیس اب تک خاص پیش رفت کرنے میں ناکام رہی تھی۔ پولیس کے ماہرین تاوان کے لیے لکھے جانے والے رقعے کا معائنہ کر رہے تھے۔ انگریزی میں نہ صرف گرامر کی بلکہ الفاظ کی غلطیاں بھی تھیں اس سے پولیس ماہرین نے نتیجہ اخذ کیا کہ مجرم یا لکھنے والا انگریزی سے نابلد تھا اور حال ہی میں امریکا آیا تھا اور اسے اپنی انگریزی بہتر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

ان خطوط کو سامنے رکھتے ہوئے پولیس نے مشرقی ساحل کی ریاستوں میں جرائم پیشہ افراد کے خلاف ایک زبردست آپریشن شروع کر دیا۔ خاص طور سے انفرادی جرائم کرنے والے افراد پر ہاتھ ڈالا گیا مگر ساتھ ہی منظم جرائم کرنے والے افراد اور ان کی تنظیموں پر بھی چھاپے مارے گئے تھے۔ اس سے ایک طرف تو جرائم پیشہ افراد میں کھلبلی مچ گئی اور وہ بسٹر کے اغوا کنندگان کو گالیاں دینے لگے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت نہ صرف پولیس بلکہ جرائم پیشہ افراد اور گروہ بھی مجرمان کو تلاش کرنے لگے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح جلدی سے بسٹر کے اغوا کرنے والے پکڑے جائیں اور کسی طرح سے بچہ واپس مل جائے تاکہ پولیس کی غیر معمولی سرگرمی ختم ہو۔

دوسری طرف عوام کا ردعمل بھی کم شدید نہیں تھا۔ ایک قومی ہیرو کے معصوم بچے کے اغوا نے زندگی کے ہر شعبے سے وابستہ افراد میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی تھی۔ اس واقعے کے نتیجے میں چند دن کے اندر اخبارات کو بیس لاکھ سے زیادہ خطوط موصول ہوئے تھے جن میں مجرموں کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ کرتے ہوئے چارلس کی فیملی سے افسوس اور یک جہتی کا اظہار کیا گیا۔ قارئین نے مطالبہ کیا تھا کہ اس واقعے کو سرد خانے میں نہ جانے دیں اور مجرموں کا تعاقب جاری رکھا جائے۔ ان سرگرمیوں نے مجرموں کے ہوش اڑا دیے۔ شاید انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس واقعے کا اتنا شدید ردعمل ہوگا۔ ہوپ ویل میں چارلس کا مکان پولیس، ایف بی آئی اور دوسری سرکاری ایجنسیوں کا گڑھ بن گیا تھا۔ کسی فرد کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ ان لوگوں کی نظروں میں آئے بغیر چارلس یا اس کے خاندان سے رابطہ کر سکے۔ شاید اسی وجہ سے مجرم یا مجرموں نے چارلس سے رابطہ نہیں کیا اور عین ممکن ہے اگر اتنا شور ہنگامہ نہ ہوتا تو مجرم تاوان کی رقم لے کر بچہ واپس کر دیتے مگر اب انہیں خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اگر انہوں نے بچے کو واپس بھی کر دیا تب بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا جائے گا اور انہیں بہرصورت کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جائے گا۔

چارلس اور این اپنے بچے کے اغوا کے غم سے نڈھال تھے۔ آئے دن انہیں پولیس، ایف بی آئی اور دوسری سرکاری ایجنسیوں کے سوالات اور تفتیش کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چارلس اور این کے لیے یہ سارے مراحل بے حد صبر آزما تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ سب ان کے بچے کی تلاش کے لیے کیا جا رہا ہے ورنہ وہ اس وقت اتنے دل برداشتہ اور مایوس تھے کہ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی دور دراز جگہ چلے جائیں جہاں انہیں کوئی تنگ کرنے والا نہ ہو مگر پولیس اور دوسرے تفتیش کاروں کے ساتھ میڈیا نے بھی ان کے گھر پر یلغار کر دی تھی۔ ہر رپورٹر کی خواہش تھی کہ وہ اسے انٹرویو دیں یا اسے تصویر کے لیے ہوز دیں۔ ظاہر ہے چارلس اور این کی حالت ایسی نہیں تھی۔ رپورٹرز اور فوٹو گرافرز نے ان کے مکان کے اردگرد ڈیرے ڈال لیے تھے اور ان کے مکان کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ صورتِ حال بھی چارلس فیملی کے لیے کم اذیت ناک نہیں تھی۔ انہیں صرف بسٹر کی بازیابی کی امید روکے ہوئے تھی۔ ان دنوں چارلس نے اپنی ساس کو ایک خط میں لکھا۔ ''زندگی ہمارے لیے بہت مشکل ہو گئی ہے اور اب دل چاہتا ہے کہ امریکا سے نکل کر چلا جاؤں۔ صرف بسٹر کی واپسی کا خیال مجھے روکے ہوئے ہے۔''

چارلس اپنی بیوی این کی نسبت زیادہ مایوس تھا۔ این پر امید تھی کہ سٹرل جائے گا جبکہ چارلس کئی بار کہہ چکا تھا کہ اغوا کنندگان سٹرل کو واپس نہیں کریں گے کیونکہ ان کے خلاف اتنا شور شرابا ہو چکا ہے کہ وہ اب کسی صورت سامنے نہیں آئیں گے اور اس ڈرامے سٹرل کو بھی واپس نہیں کریں گے کہ کہیں اس سے ان کا سراغ نہ مل جائے۔ تقریباً روزہی دونوں میاں بیوی اخبارات میں اپیل کرتے تھے کہ اغوا کنندگان ان کا بچہ واپس کردیں' وہ ان کا ہر مطالبہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ بچے کو نقصان نہ پہنچانے کی اپیل بھی کیا کرتے تھے۔ این نے اغوا کنندگان کے لیے ایک غذائی چارٹ بھی شائع کرایا تا کہ بچے کو اس کے مطابق غذا دی جائے۔

ماہرین تحریر نے تاوان والے رقعے کا مزید جائزہ لے کر یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اغوا کرنے والا جرمن ہے کیونکہ انگریزی گرامر میں اس قسم کی غلطیاں کوئی جرمن ہی کرسکتا ہے۔ ماہرین کی توجہ کا مرکز رقعے کے آخر میں دو آبس میں پیوست دکھائے جو نیلی اور سرخ روشنائیوں سے کیے گئے تھے۔ سوال یہ بھی تھا کہ کسی اغوا کرنے والے شخص کو تاوان کے رقعے پر اپنے دستخط کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے پولیس کو شبہ ہوا کہ مذکورہ شخص نفسیاتی مریض ہے اور اس نے شخصی تسکین کے لیے سٹرل کو اغوا کیا ہے۔ وہ پولیس اور ملک بھر کو ہیجان میں مبتلا کرکے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

چارلس برگ بھی جرمن تھا اور اس کا خاندان کوئی ساتھ سال پہلے جرمنی سے آکر امریکا میں آباد ہوا تھا۔ اس زمانے میں جرمنی موجودہ صورت میں قائم نہیں تھا اور نہ ہی جرمنی نام کی کوئی مملکت تھی۔ اس خاندان نے امریکا آنے کے بعد نیویارک ریاست میں رہائش اختیار کی تھی۔ اس کے اکثر افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اپنے اپنے شعبوں میں ماہر تھے۔ انہوں نے شہرت اور دولت کمائی تھی۔ چارلس برگ اس کی ایک مثال تھا۔ ریاست میں برگ خاندان کی خدمات کو سراہا جاتا تھا۔ جب چارلس کو اطلاع ملی کی اغوا کنندگان بھی جرمن ہیں تو وہ چونک گیا تھا کیونکہ جرمن ہونے کے ناتے ان کے زیادہ تر دوست جرمنوں سے تھے۔ ریاست میں آباد دوسرے افراد میں زیادہ تر اٹلی اور برطانیہ کے باشندے تھے۔ جنہیں چارلس پسند نہیں کرتا تھا۔ ملنے جلنے والے افراد میں اس کے خاندان کے علاوہ دوسرے جرمن نژاد امریکی بھی تھے۔ اکثر غریب اور روزگار کی تلاش میں آنے والے جرمن برگ خاندان سے رابطہ کرتے تھے۔ چارلس ان کی مدد کرتا تھا۔

پولیس نے چارلس سے دریافت کیا کہ ایسا کوئی جرمن نژاد شخص ہے جس سے اس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں مگر باوجود کوشش کے چارلس کو ایسا کوئی شخص یاد نہیں آسکا۔ البتہ اس نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اعتراف کیا کہ اس کی کزن میریا برگ سے اس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ ان میں بعض کاروباری معاملات میں جھگڑا ہوا تھا۔ ایک مشترکہ بزنس میں نقصان کی ذمے داری میریا نے چارلس پر ڈال دی تھی اور مطالبہ کیا تھا کہ اس کی رقم اسے واپس کی جائے جبکہ چارلس کا موقف تھا کہ نقصان دونوں کا ہوا ہے۔ اس صورت میں وہ اکیلا کیوں سارا نقصان برداشت کرے۔ اس نے میریا کو ایک چیٹ دینے سے بھی انکار کردیا تھا۔ اس پر میریا نے چارلس کے خلاف عدالت میں مقدمہ کردیا تھا مگر وہاں پر بھی فیصلہ چارلس کے حق میں ہوا تھا۔ اس پر میریا نے چارلس کو سب کے سامنے دھمکی دی تھی اور اسے کہا تھا کہ ایک دن اس کا ایسا نقصان ہوگا جس پر وہ جب تک زندہ رہے گا' پچھتاتا رہے گا۔ چارلس نے یہ بات بھی پولیس کو بتائی لہٰذا جب پولیس نے اس معاملے میں تفتیش کی غرض سے میریا سے رابطہ کیا تو اس نے تسلیم کیا کہ اس نے اشتعال کے عالم میں اس قسم کے جملے کہے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ سٹرل کے اغوا میں ملوث ہے۔ میریا نے بتایا "بعد میں میرا دل صاف ہوگیا تھا۔ میں نے چارلس سے دوبارہ روابط بڑھانے کی کوشش کی تھی لیکن چارلس اور این کا رویہ میرے ساتھ سرد رہا۔ اس لیے میں بھی پیچھے ہٹ گئی۔"

"مس میریا! کیا آپ کسی ایسے جرمن سے واقف ہیں جو حال ہی میں امریکا آیا ہو اور اس کی انگریزی اتنی اچھی نہ ہو۔" پولیس افسر نے سوال کیا تھا مگر میریا نے نفی میں جواب دیا۔ پولیس کے نقطہ نظر سے یہ ملاقات غیر سود مند رہی تھی کیونکہ میریا نے انہیں کوئی بھی کام کی بات نہیں بتائی تھی مگر اس کے چند روز بعد اتفاقاً چارلس سے ایسی بات پولیس کے علم میں آئی جس نے اسے ایک بار پھر میریا کی رہائش گاہ کا رخ کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ چارلس نے اپنے سابقہ ملازموں کے بارے میں بتایا تھا۔ اس میں ایک ملازم عورت ہیلگر مارٹی جوجینی کی حریف سے مشہور تھی' چار سال تک چارلس کے گھر میں ملازم رہی مگر جب چارلس نے این سے شادی کی تو اس نے جینی کو بعض وجوہات کی بنا پر ملازمت سے نکال دیا اور جینی نے میریا کے پاس ملازمت کرلی تھی۔ یہ تین سال پہلے کی بات تھی۔ جینی کے جانے سے ذرا پہلے ہی چارلس اور میریا کے درمیان مقدمے بازی ہو چکی تھی۔

پولیس نے جینی سے نسبتاً سختی سے تفتیش کی تھی اور اس کے بارے میں کچھ بتانے میں ناکام رہے تھے۔ خط دونوں بار عام سے کاغذ اور عام سے لفافے میں بھیجے گئے' جو عام دستیاب تھے ایک بار پھر پولیس کی ٹیک دو اندھیری گلی میں پہنچ کر ٹھپ ہوگئی تھی۔

ایک طرف تو رائے عامہ مجرمان کی گرفتاری اور سٹرل کی بازیابی کے لیے انتظامیہ پر دباؤ ڈال رہی تھی۔ دوسری طرف چارلس کے لیے ایسے خطوط کا تانتا بندھا جا رہا تھا جن میں اسے پیش کش کی جارہی تھی کہ وہ سٹرل کی بازیابی کے لیے اپنی خدمات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں جرائم پیشہ افراد بھی شامل تھے۔ حتیٰ کہ اس زمانے میں جیل میں بند مشہور زمانہ مجرم ایل کیپون نے ریاست کو پیش کش کی اگر اسے رہا کردیا جائے تو وہ سٹرل کو بازیاب کرا سکتا تھا مگر حکام نے اس کی پیش کش کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی۔

عوام میں جولوگ چارلس فیملی کی مدد کرنے کے لیے بے تاب تھے' ان میں ایک ڈاکٹر جان کیڈون بھی تھا۔ وہ نیویارک میں ہی پریکٹس کرتا تھا اور اس کا دل اس بچے کے لیے تڑپتا تھا جسے اس کی ماں سے جدا کردیا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے خود بھی بچپن ماں باپ کے بغیر ایک یتیم خانے میں گزارا تھا اور اسے بہ خوبی اندازہ تھا کہ ماں باپ سے محرومی ایک بچے کے لیے کس قدر اذیت ناک ہوتی ہے۔ چارلس اور این کے بیٹے کو اگر مجرموں نے قتل نہ بھی کیا تب بھی ماں باپ سے دوری اسے مارنے کے لیے کافی تھی۔ وہ بچہ جس نے اب تک سوائے نرمی اور شفقت کے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا' نہ جانے کیسے حالات میں اور کن لوگوں کے رحم وکرم پر ہوگا۔ ڈاکٹر کئی دن اس بارے میں سوچتا رہا کہ کیا کرے اور پھر اس نے اغوا کے ساتویں دن اخبار میں اشتہار دیا۔ اس میں مجرموں سے اپیل کی گئی تھی کہ مجرم بچے کو اس کے ماں باپ کو واپس کردے۔ اس کے عوض وہ اسے اپنی طرف سے ہزار ڈالر دے گا۔ اشتہار میں ڈاکٹر جان نے اپنا فون نمبر بھی دیا تھا۔ اس کا فوری نتیجہ نکلا۔ ابھی اخبار مارکیٹ میں آئے چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ کسی شخص نے ڈاکٹر کو فون کیا اور اس نے اپنی جرمن لہجے والی غلط سلط انگریزی میں ڈاکٹر سے کہا۔

"سنو مجھے تاوان کی رقم چاہیے۔ تمہارے ہزار ڈالرز اور چارلس کے پچاس ہزار ڈالرز۔ یہ رقم تم اس سے حاصل کرلو۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم نے رقم لے کر کہاں آنا۔"

"ٹھیک ہے' میں یہ کام کرلوں گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن میں تمہیں اس کی اطلاع کیسے دوں گا؟"

"تم اخبار میں صرف اتنا لکھوا دینا" رقم کا بندوبست

ہوگیا ہے۔" اور نیچے اپنا نام پتا میں سمجھ جاؤں گا کہ رقم تیار ہے پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ رقم کہاں دینی ہے اور بچہ کہاں ملے گا۔"

"میں ابھی چارلس سے رابطہ کرتا ہوں۔" ڈاکٹر نے پُرجوش لہجے میں کہا تھا۔ اسی لمحے اسے عقب سے کسی فرد کے اطالوی بولنے کی آواز آئی اور رابطہ منقطع ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر چارلس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ خاصی مشکل سے چارلس سے رابطہ ہوا تھا کیونکہ ان دنوں وہ مکمل طور پر گوشہ نشین تھا اور کسی بھی غیر متعلقہ فرد سے نہیں ملتا تھا۔ وہ بے دلی سے ڈاکٹر کی بات سنتا رہا اور آخر میں اتنا کہا "ٹھیک ہے تم آجاؤ..... میں تاوان کی رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔"

چارلس کے مکان پر صرف چارلس ہی نہیں بلکہ ایف بی آئی کے دو ایجنٹ بھی ڈاکٹر جان کے منتظر تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر سے طویل چھان بین کی اور چارلس کے خیال میں اس معزز اور ڈاکٹر پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی مگر ایف بی آئی ایجنٹس نے تاوان کی ادائیگی کردی۔ انہوں نے کہا "جب تک اس بات کا حتمی ثبوت نہ مل جائے کہ رابطہ کرنے والے اغوا کنندگان ہی ہیں جن کے قبضے میں بسٹر ہے، تب تک رقم ادا نہیں کرنی ہے۔"

چارلس ان کے دباؤ کے آگے مجبور ہوگیا۔ ورنہ وہ رقم دینے کے لیے تیار تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ ڈاکٹر جان ایک بار پھر نیویارک ٹائمز میں اشتہار دے گا اور اغوا کرنے والوں سے دوبارہ رابطے کا مطالبہ کرے گا۔ اگلے روز اخبار میں مذکورہ اشتہار چھپ گیا اور اسی شام ڈاکٹر جان کو ایک خط مل گیا اس میں تحریر تھا۔

"ڈاکٹر جان کیڈون! اگر تمہیں چارلس اور اس کے بچے سے ہمدردی ہے تو تاوان کی اپنی رقم تیار رکھو اور چارلس سے بھی تاوان کی رقم لے لو۔ جب یہ کام ہوجائے تو نیویارک ٹائمز میں اشتہار دے دینا اس کے بعد ہم بتائیں گے کہ تم نے کیا کرنا ہے۔" خط کے آخر میں دو رنگی دستخط تھے۔

ڈاکٹر نے فوراً چارلس سے رابطہ کیا اور جب اس نے خط کے آخر میں دو رنگی دستخطوں کا ذکر کیا تو چارلس چونک گیا تھا "خدا کی قسم..... ہی ہیں۔ ڈاکٹر تم مجھ سے تاوان کی رقم لے سکتے ہو۔ مگر اس میرا بچہ چاہیے۔"

اگلے روز نیویارک ٹائمز میں اشتہار چھپ گیا تھا "رقم تیار ہے جان ایف سی۔"

اخبار بازار میں آتے ہی ڈاکٹر جان کو ایک فون موصول ہوا "آگے کا طریقہ کار بعد میں بتایا جائے گا۔"

اس گفتگو کے دوران میں ڈاکٹر نے ایک بار پھر عقب میں کسی کے اطالوی بولنے کی آواز سنی تھی مگر اس سے پہلے کہ ڈاکٹر کوئی بات کرتا رابطہ کٹ چکا تھا۔ اگلے روز اسے ایک اور خط موصول ہوا۔ اس میں لکھا تھا کہ اگلا پیغام ایک اور مقام پر ملے گا۔ وقت اور مقام اس خط میں تھا۔ ڈاکٹر جان مقررہ جگہ پہنچا تو اسے اسٹریٹ نمبر 233 میں واقع قبرستان میں پہنچنے کا حکم ملا۔ مجرم پوری احتیاط سے کام لے رہے تھے اور یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ ڈاکٹر جان کی نگرانی بھی کررہے تھے تاکہ اس کے ساتھ کوئی مشکوک فرد یا پولیس ہو تو ان کی نظر میں آجائے۔ ڈاکٹر قبرستان پہنچا۔ شام کے وقت وہاں مکمل خاموشی تھی۔ ڈاکٹر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسے قبروں کے بیچ ایک نقاب پوش نظر آیا۔

"کیا تم رقم لے آئے ہو؟"

اس وقت تک اغوا کرنے والوں نے اپنا مطالبہ بڑھا کر ستر ہزار ڈالرز کردیا تھا مگر فوری طور پر اتنی رقم کا حصول ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹر جان نے وضاحت کی "ہمارے پاس وقت کم تھا اس لیے ہم....."

"تمہارے ساتھ کوئی آیا ہے.....!" نقاب پوش جو جسم اور آواز سے جوان لگ رہا تھا۔ خوف زدہ ہوگیا اور تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔

"اے..... رک جاؤ" ڈاکٹر نے چلا کر اسے آواز دی۔ "میں کسی کو نہیں لایا ہوں۔ مگر جب نقاب پوش نہیں رکا تو ڈاکٹر جان نے اس کا تعاقب کیا۔ جان تنومند شخص تھا۔ نقاب پوش اس کے مقابلے میں ہلکا تھا۔ اس نے جلد نقاب پوش کو جالیا "میری بات تو سنو تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام جان ہے..... پلیز مجھے جانے دو۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"تم بھاگے کیوں تھے؟" ڈاکٹر جان نے اپنے ہم نام سے پوچھا۔

اس سوال کے جواب میں نقاب پوش نے عجیب سا سوال کیا "سنو..... اگر بچہ مرجائے تو کیا مجھے موت کی سزا ہوگی؟"

ڈاکٹر جان کو شاک لگا تھا "کیا..... کیا' کیا ہے تم لوگوں نے بچے کے ساتھ؟" وہ چلا اٹھا تھا۔

"کچھ نہیں..... بچہ صحیح سلامت ہے اور یہاں سے چھ گھنٹے کی مسافت پر ہے۔" نقاب پوش نے سہمے ہوئے انداز میں بتایا۔ "مجھے جانے دو۔ اگر میں نہیں گیا تو وہ لوگ بچے کو مار دیں گے۔"

"سنو' ہم تاوان کی رقم دینے کے لیے تیار ہیں لیکن اس سے پہلے ہمیں یقینی ثبوت چاہیے کہ بچہ تمہارے پاس ہے اور صحیح سلامت ہے۔"

"ثبوت کل تک تمہیں مل جائے گا۔" نوجوان کہہ کر چلا گیا۔

ڈاکٹر جان شک میں تھا کہ اسے اور چارلس کو بے وقوف بنایا جارہا ہے لیکن اگلے روز اسے ایک پارسل ملا جس میں بچگانہ لباس تھا۔ ڈاکٹر جان فوراً یہ لباس لے کر چارلس کے پاس گیا تھا۔ لباس دیکھتے ہی وہ جھپٹا تھا۔ "یہ کہاں سے ملا۔ یہ لباس بسٹر نے اغوا ہوتے وقت پہن رکھا تھا۔"

ڈاکٹر نے اسے تفصیل سے اپنی اور نقاب پوش کی ملاقات کا احوال سنایا "اب اس سے دوسری ملاقات اسی جگہ طے ہے۔ ہمیں ستر ہزار ڈالرز دینے ہیں۔"

"میں اس کا بندوبست کرچکا ہوں۔" چارلس نے اسے بتایا۔

دو دن بعد ڈاکٹر جان ایک چوبی ڈبے میں بند پچاس ہزار گولڈ ڈالرز لے کر قبرستان پہنچا تھا۔ 1930ء میں جب اقتصادی بحران نے کرنسی کی قدر کو شدید نقصان پہنچایا تھا اور لوگوں کا کاغذی کرنسی پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا تو امریکی حکومت نے گولڈ ڈالرز جاری کیے تھے۔ یہ ایک طرح کے بانڈ تھے یعنی ہر نوٹ کے پیچھے اتنی ہی مالیت کا سونا موجود تھا۔ اس طرح عوام کا کاغذی کرنسی پر اعتماد بحال ہوا تھا۔ ڈاکٹر جان مطالبے پر یہی گولڈ ڈالرز لایا تھا مگر اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ اس میں ہر نوٹ کا نمبر پولیس کے پاس محفوظ تھا اور مجرم اس رقم کو استعمال کرتے تو کہیں نہ کہیں گرفت میں آجاتے۔ اس روز بھی وہی نقاب پوش آیا تھا' جان نے محسوس کیا کہ وہ ایک تو غیر ملکی تھا یعنی اس کی انگریزی درست نہیں تھی' دوسرے اس کے لہجے میں جرمن زبان جھلکتی تھی۔

"کیا تم رقم لے آئے ہو؟" نقاب پوش نے پوچھا۔

ڈاکٹر جان نے اسے چوبی ڈبا دکھایا "رقم اس میں ہے..... مگر بچہ کہاں ہے؟"

"پھر مل جائے گا۔ میں کل صبح بذریعہ خط تمہیں بتاؤں گا کہ بچہ کہاں ملے گا۔"

"ایک بات اور..... ہم ستر ہزار ڈالرز کا بندوبست نہیں کرسکے۔ صرف پچاس ہزار ڈالرز ہوئے ہیں۔"

"لگتا ہے تم لوگوں کو بچے کی پروا نہیں ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" ڈاکٹر پریشان ہوگیا تھا "یہ رقم لے لو اور بچہ واپس کردو۔ یقین کرو اس کے ماں باپ بہت پریشان ہیں۔"

نقاب پوش نے کچھ دیر سوچا اور اس سے چوبی ڈبا لے کر وہاں سے چلا گیا۔ "بچے کے بارے میں کل بتاؤں گا۔"

نقاب پوش نے جاتے ہوئے کہا تھا اور جلد وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ اس بار چارلس بھی ڈاکٹر جان کے ساتھ آیا اور اس نے اپنی آنکھوں سے اس نقاب پوش کو دیکھ لیا تھا جو دھوئی کررہا تھا کہ چارلس کا بیٹا اس کے قبضے میں ہے۔ چارلس اس ملاقات کے دوران میں بالکل خاموش رہا تھا۔ نقاب پوش کے جانے کے بعد اس نے پُرامید لہجے میں ڈاکٹر جان سے پوچھا "کیا وہ میرے بچے کو واپس کردیں گے؟"

"ہمیں امید یہی رکھنی چاہیے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا تھا۔

"مجھے یہ شخص لہجے سے جرمن لگتا ہے۔" چارلس بولا۔

"کل بھی اس نے جب کشتی کا ذکر کیا تھا تو لفظ "بوٹ" ادا کیا تھا۔ صرف جرمن ہی یہ لفظ بولتے ہیں۔"

اگلے روز ڈاکٹر جان بے تابی سے ڈاکیے کا انتظار کررہا تھا۔ خدا خدا کرکے آٹھ بجے ڈاکیا آیا' ڈاک میں خاص زرد لفافہ تھا۔ اب تک اغوا کنندگان نے تمام خط اسی قسم کے لفافے میں بھیجے تھے۔ حسب توقع اندر سے اس کا خط نکلا۔ اس میں لکھا تھا کہ بچہ نیویارک سے ذرا دور الزبتھ آئی لینڈ میں نیلی نامی ایک کشتی پر موجود ہے۔ چارلس اسے وہاں سے حاصل کرسکتا ہے۔"

ڈاکٹر نے سب سے پہلے پولیس کو اس امر کی اطلاع دی۔ چارلس اس کے گھر پر ہی تھا۔ وہ اس کے ہمراہ الزبتھ آئی لینڈ روانہ ہوگیا تھا۔ وہاں نیلی نامی کشتی پولیس پہلے ہی دریافت کرچکی تھی مگر اس پر چارلس کا بچہ نہیں تھا۔ ان کی مایوسی کی حد نہ رہی تھی۔ مجرموں نے انہیں بے وقوف بنایا تھا۔ تاوان کی رقم حاصل کرلی تھی مگر بچہ ان کے حوالے نہیں کیا تھا۔ وہ تھکے ہارے واپس لوٹ آئے تھے۔ پولیس نے نیلی نامی کشتی کے مالک سے تفتیش کی لیکن وہ اس معاملے میں بے گناہ نکلا تھا۔ اس کا مجرموں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ انہوں نے محض اس کا نام استعمال کیا تھا۔ تفتیش کی گاڑی ایک بار پھر ٹھپ ہوگئی تھی۔

این کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ درد کر بے حال ہوگئی حتیٰ کہ اس کی ماں آکر اسے اپنے گھر لے گئی۔ یہ وقت چارلس کے لیے بہت کڑا تھا۔ بچے کے بعد بیوی بھی چلی گئی تھی۔ وہ سارا سارا دن گھر میں چکر اتا رہتا' اس کے کان ہمہ وقت

BY SALIM SALKHAN

دروازے یا فون کی گھنٹی پر لگے رہتے تھے کہ شاید بستر کے بارے میں کوئی خبر آئے۔ ان کی جانب سے اخبارات اور ریڈیو میں انہیں متواتر چھپ رہی تھیں مگر ناداں وصولی کے بعد مجرموں نے دوبارہ ان سے رابطہ کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اشارات اس معاملے سے لاعلم تھے اور ان کی طرف سے حاشیہ آرائی جاری تھی۔ بعض کالم نگار شبہ ظاہر کررہے تھے کہ بچے کو مجرموں نے ہلاک کردیا تھا یا وہ خود ہی مرگیا تھا۔ مجرموں کی طرف سے رابطہ نہ کرنے کی ایک یہی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ پانچ ہفتے بعد جب بستر کی بازیابی کی امید بالکل ہی ختم ہوچکی تھی۔ پولیس کو ایک سیاہ فام ٹرک ڈرائیور نے چارلس کے گھر سے ذرا فاصلے پر جنگل میں چوں سے ڈھکی ایک معصوم بچے کی قبر کے بارے میں بتایا۔ یہ قبر اس نے اتفاق سے دریافت کرلی تھی۔ جب وہ رفع حاجت کے لیے ٹرک سے اتر کر جنگل میں گیا تھا۔ پولیس نے اس جگہ کھدائی کی تو انہیں چند انچ مٹی کی تہ تلے سے ایک بچے کے الگ الگ اعضا ملے۔ تمام اعضا اس حد تک خراب ہوچکے تھے کہ کسی قسم کی شناخت ممکن نہیں رہی تھی۔ لاش پانچ ہفتے سے زیادہ پرانی تھی یعنی بستر اس روز قتل کردیا گیا تھا جس روز اغوا ہوا تھا۔ شقی القلب مجرم نے اس کے ٹکڑے کرکے جنگل میں دفنا دیے تھے۔ لاش کے ملنے سے چارلس اور اس کے خاندان کی بستر کی بازیابی کے لیے جو موہوم سی امیدیں رہ گئی تھیں وہ بھی دم توڑ گئیں۔ چارلس اور این بچے سے جدائی کے اندوہ ناک دکھ میں ڈوب گررہ گئے تھے۔ اس واقعے نے ان کے درمیان دراڑیں ڈال دی تھیں۔ این پہلے ہی اپنی ماں کے گھر میں تھی اور اس نے چارلس کے پاس واپس آنے سے انکار کردیا تھا۔ یوں چند دن کے اندر ایک ہنستا بستا خاندان اجڑ کر رہ گیا تھا۔

چارلس پہلے ہی امیریکا سے بے زار آیا ہوا تھا۔ اس نے اس ملک میں آنکھ کھولی تھی یہاں پرورش پائی تھی۔ دولت اور شہرت کمائی تھی لیکن بستر کے جدا ہونے سے لگ رہا تھا جیسے اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے۔ جرمنی میں موجود برگ خاندان والوں نے اس سے افسوس کے اظہار کے ساتھ اسے جرمنی آنے کی دعوت دی تھی کہ وہ اس سانحے کے اثرات سے سنبھل جائے۔ سوچ بچار کے بعد چارلس نے یہ دعوت قبول کرلی۔ اس نے امریکا میں اپنا کاروبار سمیٹ دیا' اپنا مکان فروخت کردیا اور جرمنی روانہ ہوگیا۔ ان دنوں جرمنی نازی اسٹیٹ میں تبدیل ہورہا تھا۔ ہٹلر برسراقتدار آگیا تھا اور اس کے فلسفے نے جرمن عوام کو نشے کی طرح اپنا عادی بنالیا تھا۔ پورا جرمنی نیشنل ازم کے بخار میں جل رہا تھا۔ چارلس بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اگرچہ وہ جنگِ عظیم سے پہلے ہی جرمنی سے واپس آگیا تھا مگر وہ زندگی بھر نازی ازم کا شیدائی رہا تھا۔ جب جنگِ عظیم چھڑی اور امریکا پر جنگ میں کودنے کے لیے دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اس وقت چارلس اور اس جیسے ہائر جنگ کے مخالفوں نے امریکی حکومت کو مشورہ دیا کہ اس مرحلے پر اسے جنگ میں شامل ہونے کے بجائے اپنی توانائیاں بچانی چاہئیں اور عظیم طاقت بننے کے لیے محفوظ مرحلے پر جنگ میں کودنا چاہیے۔ امریکا نے یہی کیا تھا۔ وہ اتحادیوں کو اسلحے اور رقم سے امداد تو فراہم کررہا تھا مگر بذاتِ خود جنگ میں وہ اس وقت کوداجب روس نے جرمنی کو پسپا کرنا شروع کردیا تھا۔ یوں امریکا نے اس جنگ سے حقیقی معنوں میں فائدہ اٹھایا اور جنگ کے بعد سپر پاور بن کر ابھرا تھا۔ یقیناً یہ چارلس اور اس جیسے افراد کا دانش مندانہ کردار تھا کہ امریکا آغاز میں جنگ میں شامل ہونے سے باز رہا تھا۔

چارلس مایوس ہوکر چلا گیا تھا مگر پولیس کے لیے ننھے بستر کے اغوا کنندہ اور قاتل کی تلاش کا کام باقی تھا۔ جس وقت پولیس مختلف افراد سے تفتیش کررہی تھی' ایک نجی سراغ رساں آر تھر کیلر نے واقعاتی شہادتوں کی طرف توجہ دی' اس نے موقع واردات سے ملنے والی لکڑی کی سیڑھی کا معائنہ کیا اور اس کا تجزیہ کرایا۔ اس نے لکڑی کے ٹھوٹے تختہ' جنگلات کی لیب کو بھیجے کہ اس کے بارے میں تجزیہ کرکے بتائے۔ وہاں سے رپورٹ آئی کہ لکڑی برونکس کے نواح کے جنگلات سے آئی ہے۔ اس اطلاع نے پولیس کو بھی چونکا دیا تھا کیونکہ مجرم نے ڈاکٹر جان کا اشتہار فورآئرن ہیڈ لیا تھا۔ لکڑی ایک مینی دی کیشنل نیمرل ورک سے خریدی گئی تھی۔ مذکورہ ساخت کی لکڑی صرف ان کے پاس آتی تھی۔

پولیس کی واحد امید گولڈ ڈالرز کے نمبرز تھے جو اس کے پاس محفوظ تھے اور اب تک کئی گولڈ ڈالرز پولیس کے پاس آچکے تھے لیکن انہیں چلانے والوں کا سراغ نہیں ملا تھا۔ مئی 1934ء کے آغاز میں امریکی حکومت نے اچانک گولڈ ڈالرز منسوخ کردیے اور جن کے پاس یہ ڈالرز تھے' انہیں حکم دیا کہ بینکوں کو یہ ڈالرز واپس کرکے اس کے بدلے عام ڈالرز حاصل کرلیں۔ اس اقدام نے یقیناً اغوا کنندگان کے ہوش اڑا دیے ہوں گے کیونکہ وہ کسی بینک کا رخ نہیں کرسکتے تھے۔ اتنا علم تو انہیں بھی تھا کہ پولیس نے ان نوٹوں کے نمبرز اپنے پاس محفوظ کرلیے ہوں گے۔

اب مجرموں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ ان بائذز کو انفرادی طور پر ایسی جگہوں پر چلانے کی کوشش کریں جہاں نمبروں وغیرہ کا زیادہ دھیان نہ رکھا جاتا جیسے پیٹرول پمپس۔ 15 ستمبر 1934ء کے دن نیو یارک کے نواحی علاقے میں واقع پیٹرول پمپ پر ایک گاڑی رکی۔ اس لمبے کے حامل شخص نے پیٹرول بوائے سے گاڑی کی ٹنکی فل کرنے کو کہا اور معاوضے میں اسے دس ڈالرز مالیت کا گولڈ ڈالر دیا۔ لڑکا ہچکچایا تو اس شخص نے اسے تسلی دی ''یہ بالکل ٹھیک ہے' کوئی بھی بینک والا تم سے لے کر اتنی ہی مالیت کے ڈالرز دے دے گا۔'' اس کے مجبور کرنے پر لڑکے نے نوٹ لے لیا۔

ایک دن بعد جب پیٹرول پمپ کے مالک نے یہ ڈالر بینک میں تبدیل ہونے کے لیے دیا تو وہاں پر اس کا نمبر ان نمبروں سے میچ کرگیا جو چارلس نے تاوان میں اغوا کنندہ کو دیے تھے۔ پولیس نے یہ نمبر ہر بینک اور بڑے اسٹور پر فراہم کررکھے تھے۔ بینک نے فوراً پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس نے آکر پیٹرول پمپ کے مالک اور پمپ بوائے سے پوچھ گچھ کی۔ چالاک لڑکے نے چپکے سے گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا تھا تاکہ بائذ میں کوئی مسئلہ نکلے تو پولیس کو اطلاع دی جاسکے۔ یہ تو بہت بڑا مسئلہ نکل آیا تھا۔ اس سراغ نے پولیس تفتیش میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اب تک تفتیش کی گاڑی رک رک کر چل رہی تھی۔ پولیس نے فوری طور پر بروکلن کے ٹریفک بیورو سے رجوع کیا اور وہاں سے کار کے مالک کا نام اور پتا نکلوایا۔ کار کے مالک کا نام رچرڈ ہاپٹ مین تھا۔ وہ جرمن نژاد تھا اور برونکس کی اسٹریٹ 222 کے مکان نمبر 1279 میں مقیم تھا۔

پتا معلوم ہوتے ہی پولیس فورس نے رچرڈ ہاپٹ مین کے مکان کو گھیر لیا تھا۔ صبح ایک شخص اندر سے نکلا اور گھر کے سامنے کھڑی نیلے رنگ کی کار میں سوار ہوکر چل پڑا۔ پولیس والے تیار تھے' انہوں نے کار کا تعاقب کیا اور اسے چند بلاک کے بعد جالیا تھا۔ رچرڈ نے گرفتاری دینے میں ذرا مزاحمت نہیں کی۔ پولیس کے جوانوں نے جب اسے دبوچ کر اس کی تلاشی لی تو اس کی جیب سے مزید بیس گولڈ ڈالرز کے دو نوٹ نکلے تھے ان کے نمبرز وہی تھے جو چارلس نے تاوان کی رقم میں دیے تھے۔ پولیس اسے اس کے گھر تک لائی جہاں سے مزید ڈیڑھ ہزار دو سو ڈالرز مالیت کے گولڈ بائذز برآمد ہوئے' ان کے ہوتے ہوئے کوئی شک نہیں تھا کہ ہاپٹ مین ہی بستر کو اغوا اور اسے قتل کرنے والا شخص ہے۔ ڈالرز اس نے بڑی ہوشیاری سے چھپا رکھے تھے مگر پولیس والوں نے ڈھونڈ نکالے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے مکان کی نچلی کوٹھری میں لکڑی کے ایک تختے پر ڈاکٹر جان کیڈون کا فون نمبر بھی لکھا ہوا پایا گیا تھا۔ سب سے اہم ثبوت پولیس کو مکان کی دوبچھتی کے فرش سے ایک بڑے غائب تختے کی صورت میں ملا۔ اس کی لکڑی بالکل ویسی تھی جیسی اس لکڑی کی سیڑھی کی جو بستر کے کمرے کے باہر ملی تھی۔ دوبچھتی پر لکڑی کا یہ ٹکڑا جو پھیلا تھا جس سے ظاہر تھا کہ اس تختے کو باقاعدہ چیر کر نکالا گیا ہے۔

رچرڈ ہاپٹ مین کو گرفتار کرکے پولیس ہیڈ کوارٹر لایا گیا جہاں ماہرین نے اس سے وہ الفاظ لکھوائے جو تاوان کے نوٹ لکھے جانے والے رقعوں پر تھے۔ ماہرین نے نوٹ کیا کہ ہاپٹ مین نے بھی ٹھیک وہی غلطیاں کی تھیں جو رقعے لکھنے والے نے کی تھیں مگر ہاپٹ مین کی لکھائی قدرے بہتر تھی۔ اس سے دریافت کیا گیا کہ اسے یہ رقم کہاں سے ملی ہے تو اس نے جواب دیا۔

''میرا ایک دوست ایبی ڈورنش یہ رقم میرے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اب اس کا انتقال ہوچکا ہے۔''

''ڈورنش کون تھا؟'' پولیس سراغ رساں نے دریافت کیا تو ہاپٹ مین اس کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکا۔

ہاپٹ مین ترکھان یعنی بڑھئی تھا۔ اس نے لڑکپن عمری سے چوریاں شروع کردی تھیں۔ ایک موقع پر وہ پکڑا گیا اور ایک جرمن عدالت نے اسے پانچ سال کے لیے جیل بھیج دیا۔ رہائی کے بعد اس نے دوبارہ چوریاں شروع کیں اور جلد دوبارہ پکڑا گیا۔ اس بار اسے لمبی سزا ہوئی تھی مگر وہ جیل سے فرار ہوگیا اور پھر کسی نہ کسی طرح جرمنی سے بھی فرار ہوکر امریکا آگیا۔ وہ غیر قانونی طور پر امریکا میں داخل ہوا تھا۔ شہریت حاصل کرنے کے لیے اس نے ایک متلاشی لڑکی سے شادی کی اور ایک بار پھر بڑھئی کا پیشہ اپنا لیا تھا۔ جلد اس کا کام چل نکلا اور وہ پچاس ساٹھ ڈالرز ایک ہفتے میں کمانے لگا تھا مگر جلد اس کی پرانی عادت لوٹ آئی۔ اس نے کام سے دل ہی سے کرنا شروع کردیا تھا' گزشتہ دو سال سے اس نے کوئی کام نہیں کیا تھا مگر جب پولیس نے اس کا بینک بیلنس چیک کیا تو وہ حیرت انگیز طور پر بڑھتا ہی جارہا تھا۔

پینتیس سالہ ہاپٹ مین نے رقم کے بارے میں کچھ اس قسم کی کہانی سنائی کہ 1932ء میں اس نے ڈورنش کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کیا اور اس نے اس میں ساڑھے سات ہزار ڈالرز کا سرمایہ لگایا تھا۔ 1933ء میں ڈورنش جرمنی واپس چلا گیا اور اگلے سال اس کا وہیں انتقال ہوگیا۔ وہ ہاپٹ مین کا

بڑا مقروض تھا مگر وہ کسی طرح اپنا قرض واپس نہیں لے سکتا تھا۔ اسی ا زبردست بارشوں کی وجہ سے اس کوٹھری میں پانی بھر گیا۔ میں ڈوبنے رہا کرتا تھا۔ ہاپٹ مین نے اس کا گلا سڑا سامان پھینک دیا مگر جوتے کے ایک ڈبے سے یہ رقم نکل آئی۔ نوٹ گیلے تھے جنہیں اس نے سکھا کر اپنے پاس رکھ لیا اور سمجھ لیا کہ اس نے اپنا قرض وصول کرلیا ہے۔ اس سے پہلے اس نے گرفتاری کے فوراً بعد بتایا تھا کہ یہ رقم ڈورفش اس کی کار میں چھوڑ گیا تھا۔ اس طرح اس کے بیان میں تضاد آرہا تھا۔

پولیس نے ہاپٹ مین پر تنخے چارلس جونیئر بسٹر کے اغوا اور اس کے قتل کا مقدمہ بنا کر عدالت میں پیش کردیا سب سے اہم ثبوت تاوان والے نوٹ اور لکڑی کی سیڑھی تھی۔ ماہرین نے تصدیق کی کہ یہ بالکل اسی طرح کی لکڑی ہے جیسی بالاخانے۔ کمرفرش کی لکڑی ہے اور اس کے غائب تختے سے سیڑھی بنائی جاسکتی تھی۔ اس کے بارے میں ہاپٹ مین کا کہنا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کا بڑھئی ہے اور اتنی بھدی سیڑھی بنا ہی نہیں سکتا ہے مگر عدالت نے اس کی یہ دلیل تسلیم نہیں کی تھی۔ ہر چیز اس کے خلاف جارہی تھی۔ استغاثے کے ساتھ جج کا رویہ بھی مخالفانہ تھا۔ اس کا وکیل کچھ نہیں کرسکا اور بالآخر فروری 1935ء میں اسے سزائے موت ہوگئی۔ اعلیٰ عدالت نے بھی اس کی اپیل مسترد کردی تھی اور اسے سزا کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

اتفاق سے ریاست کا گورنر ہوف مین آیا اور اس نے ہاپٹ مین سے اس کی کہانی سنی۔ اس نے التجا کی کہ بالاخانے کا گمشدہ تختہ تلاش کیا جائے اور یہ سب اسے بچانے کے لیے کیا گیا ہے۔ گورنر ہوف مین جو خود بھی جرمن نژاد تھا' اس کی کہانی سے متاثر ہوا اور اس نے ازخود تحقیقات شروع کیں۔ پولیس نے اس کے اصرار پر بادل ناخواستہ ہاپٹ مین کے مکان اور ورکشاپ کی دوبارہ تلاشی لی تو انہیں سچ مچ وہ گمشدہ تختہ مل گیا تھا۔ یوں ثابت ہوگیا کہ سیڑھی ہاپٹ مین نے نہیں بنائی تھی' کم سے کم دو چھتی سے تختہ نکال کر نہیں بنائی تھی۔ اس دریافت سے ہاپٹ مین کو ملنے والی سزا پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ ریاست کا اٹارنی جنرل ہوف مین کا مخالف تھا اس لیے وہ ہاپٹ مین کو سزا دلوانے کے لیے سرگرم ہوگیا۔ اس کی دوبارہ کیس اوپن کرنے کی اپیل بھی مسترد ہوگئی اور 3 اپریل 1936ء کی صبح بجلی کی کرسی پر بٹھا کر اسے سزائے موت دے دی گئی تھی۔

ہاپٹ مین کی بیوی جو بعد میں اس کی بیوہ بنی۔ اس نے مقدمے کے دوران میں پولیس کی مسلسل پوچھ گچھ سے تنگ آکر مکان چھوڑ دیا تھا۔ جب ہاپٹ مین کو سزائے موت سنائی گئی تو وہ واپس آئی تھی اور اس نے ہاپٹ مین کے حق میں اخبارات میں بیانات دینا شروع کردیے۔ اس کا اصرار تھا کہ اس کا شوہر بے گناہ ہے۔ امریکی معاشرے کی یہ روایت ہے کہ کسی بھی مسئلے میں لازماً دو فریق بن جاتے ہیں لہٰذا کچھ لوگ ہاپٹ مین کی بے گناہی کے بھی قائل تھے۔ مگر وہ اسے سزائے موت سے نہیں بچا سکے۔ اس کے بعد ہاپٹ مین کی بیوی نے اس کی بے گناہی کے حق میں باقاعدہ مہم چلانی شروع کردی۔ اس کا کہنا تھا کہ استغاثہ نے الزام پوری طرح ثابت نہیں کیا تھا اور بہت سارے لوگ اس سے اتفاق کرنے لگے تھے۔

صحافی بھی شک میں پڑ گئے اور انہوں نے اپنے طور پر تحقیقات شروع کردی تھیں۔ اس پر آرٹیکل اور کتابیں لکھی جانے لگیں حتیٰ کہ ایک صحافی تھیون رائٹ نے کتاب لکھی' جس کا عنوان تھا۔ ''چارلس برگ بے بی کی تلاش'' اس کتاب میں اس نے دعویٰ کیا کہ بسٹر کو سرے سے قتل ہی نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ زندہ ہے۔ رائٹ نے اعلان کیا تھا کہ معروف امریکی تاجر ہیرالڈ سن ہی اصل میں بسٹر ہے۔ اسے بچپن میں ولسن خاندان کے حوالے کیا گیا تھا اور جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ بدمعاشوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ اسے یہ تک کہا گیا کہ وہ ایل کیپون کی اولاد ہے۔ کسی ذریعے سے نہیں معلوم ہوسکا کہ ہیرالڈ کو ولسن خاندان کے حوالے کرنے والے کون تھے لیکن ایک بات ہے کہ ہیرالڈ اور چارلس کی صورتوں میں شباہت پائی جاتی تھی۔ خاص طور سے آنکھوں اور تھوڑی کی بناوٹ ایک جیسی تھی۔ مگر یہ بات بھی ثبوت کو نہیں پہنچ سکی۔ رائٹ کا کہنا تھا کہ ایل کیپون نے دراصل اپنی رہائی کے لیے بسٹر کو اغوا کرایا تھا اور پھر اسے بازیاب کرانے کے لیے اپنی رہائی کی شرط رکھی مگر جب حکام نے اس کی پیش کش مسترد کردی تو اس نے مٹھے بسٹر کو قتل کرانے یا واپس کرنے کے بجائے ولسن خاندان تک پہنچا دیا۔

چارلس کے مکان کے نزدیکی جنگل سے ملنے والی لاش کے بارے میں رائٹ کا کہنا تھا کہ وہ بسٹر کی نہیں تھی بلکہ نزدیک ہی واقع یتیم خانے میں غفلت سے وفات پاجانے والے کسی بچے کی لاش تھی جسے اس جگہ لاکر دفن کردیا گیا تھا۔ بہرحال یہ حقیقت ہے' ہاپٹ مین کے خلاف استغاثہ مغلوط نہیں تھا اور اسے رائے عامہ کے دباؤ پر سزائے موت سنائی گئی تھی جس کا شاید وہ مستحق نہیں تھا۔

**

by salimsalkhan